عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان کا ایک اہم فیصلہ

(ترجمہ از ملک غلام علی صاحب)

[جناب جسٹس محمد شفیع صاحب جج مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جس فیصلے کے بیشتر حصے کا ترجمہ ذیل میں دیا جا رہا ہے، یہ دراصل ایک اپیل کا فیصلہ ہے جس میں اصل مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ ایک بیوہ اپنی نابالغ اولاد کی موجودگی میں اگر ایسے مرد سے نکاحِ ثانی کرے جو اولاد کے لیے غیر محرم ہو، تو ایسی صورت میں آیا اس بیوہ کے لیے اس اولاد کی حضانت کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں؟ اس امرِ متنازعہ فیہ کا فیصلہ کرتے ہوتے فاضل جج نے بڑی تفصیل کے ساتھ اِن اصولی مسائل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلام میں قانون کا تصور، اور قانون سازی کا طریق کیا ہے؟ قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی مسلمانوں کے لیے مأخذِ قانون تسلیم کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اور بالخصوص پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت کہاں تک فقہ حنفی کے قواعد و ضوابط کی پابند سمجھی جا سکتی ہے؟ اس لحاظ سے یہ فیصلہ اسلامی قانون کے اساسی اور اہم ترین مسائل کو اپنے دائرۂ بحث میں لے آیا ہے۔

اس فیصلے کے جو حصے اصل مقدمے سے متعلق ہیں ان کو چھوڑ کر صرف اس کے اصولی مباحث کا ترجمہ یہاں دیا جا رہا ہے۔ بعض مقامات پر فیصلے میں جو قرآنی آیات نقل کی گئی ہیں انہیں معہ ترجمہ درج کرنے کے بجائے صرف سورۃ اور آیات کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ پی، ایل، ڈی ۱۹۶۰ء، لاہور (صفحہ ۱۱۴۲ تا ۱۱۷۹) کے مطبوعہ متن کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اصل اور مکمل فیصلہ وہیں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ غلام علی]

۴ - بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جاتے کہ ولی کا تقرر ضروری تھا اور گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ ۱۷ کا اطلاق اس مقدمے پر ہوتا تھا، تب ایک بڑا فیصلہ طلب سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کا ایک نابالغ پابند ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ نابالغان اور ان کے والدین مسلمان ہیں اور مسلم لا کے تابع ہیں لیکن اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے کہ ولایتِ نابالغ کے معاملے میں وہ کونسا قانون ہے جس کی پابندی لازم ہے۔ تقریباً تمام کی تمام کتابیں، جن میں سے بعض انتہائی مشہور و معروف اور قابلِ احترام قانون دانوں اور ججوں کی تصانیف ہیں، ایسے قواعد و ضوابط پر مشتمل ہیں، جن کی پابندی نابالغان کی ذات اور جائداد کی ولایت کے معاملے میں، ایک عرصۂ دراز سے ہند و پاکستان میں کی جا رہی ہے۔ درحقیقت ہندوستان کی جملہ عدالتیں بشمول سپریم کورٹ، برطانوی عہد قبل تقسیم سے لے کر اب تک اِن قواعد کی سختی سے پابندی کرتی رہی ہیں۔ اس امر کا امکان موجود ہے کہ برطانوی حکومت سے پہلے کے قاضی اور ماہرین قانون بھی ان قواعد و ضوابط کی پیروی کرتے رہے ہوں اور بعد میں بھی ان کی پابندی کی جاتی رہی ہو، کیونکہ مسلمان قانون دان یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریز یا دوسرے غیر مسلم اپنے مقصد کے مطابق قرآنِ پاک کی تفسیر و تعبیر کریں اور قوانین بنائیں۔ فتاویٰ عالمگیری کو مسلم قانون سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن اب حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ یہ قواعد و ضوابط مختصراً درج ذیل ہیں:

[اس کے بعد پیراگراف ۴ کے بقیہ حصے اور پیراگراف ۵ و ۶ میں فاضل جج نے مسئلہ حضانت کے بارے میں حنفی، شافعی اور شیعہ فقہ کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں]۔

۷ - جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اصل تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کیا کسی درجے کی قطعیت کے ساتھ اِن قواعد کو اسلامی قانون کہا جا سکتا ہے جسے وحی لزوم کا مرتبہ حاصل ہو

جو ایک کتابِ آئین میں درج شدہ قانون کو حاصل ہوتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آیا یہ وہی قانون ہے جس کی پابندی گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کی دفعہ ۱۷ کے منشا کے مطابق ایک مسلم نابالغ پر واجب ہے؟

۸۔ مسلمان کے عقیدے کی رُو سے، قطع نظر اس کے کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے جو قانون اُس کی زندگی کے ہر شعبے میں حکمران ہونا چاہیے، خواہ وہ اس کی زندگی کا مذہبی شعبہ ہو یا سیاسی، یا معاشرتی یا معاشی، وہ صرف خدا کا قانون ہے۔ اللہ ہی حاکمِ اعلیٰ ہے، علیم و حکیم ہے اور قادرِ مطلق ہے۔ اسلام میں خدا اور بندے کے مابین تعلق سادہ اور بلاواسطہ ہے۔ کوئی پیشوا، امام، پیر یا کوئی دوسرا شخص (خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، قبر میں ہو یا قبر سے باہر ہو) اس تعلق کے مابین وسیلہ بن کر حائل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں پیشہ ورانہ پیشواؤں کا کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں جو اپنی لعنت کی دھمکی دے کر اور خدا کے غضب کا اجارہ دار بن کر، اپنے مزعومات کو تحکمانہ انداز میں ہم پر ٹھونسے۔ قرآن نے جو حدود مقرر کر دیئے ہیں، ان کے اندر مسلمانوں کو سوچنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اسلام میں ذہنی اور روحانی حریت کی فضا موجود ہے۔ چونکہ قانون انسانی آزادی پر پابندیاں عائد کرنے والی طاقت ہے اس لیے خدا نے قانون سازی کے اختیارات پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ اسلام میں کسی شخص کو اس طرح کام کرنے کا اختیار نہیں جیسے گویا کہ وہ دوسروں سے بالاتر ہے۔ قرآن انفرادیت پسندی کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ اسلام نے عالمگیر اخوت اور کامل مساوات کا سبق دے کر اپنے اخلاقی نظام کے اندر انسان پر سے انسان کے تفوق اور برتری کو بالکلیہ ختم کر دیا ہے، خواہ وہ برتری علمی دائرے میں ہو یا زندگی کے دوسرے دوائر میں۔ دنیا بھر کے مسلمان نہیں تو کم از کم ایک ملک کے مسلمانوں کا ایک ہی لڑی میں پرویا جانا ضروری ہے۔ اسلامی ریاست میں ایسے شخص کا وجود ناممکن ہے جو مطلق العنانی اور شاہنشاہانہ اختیارات کا مدعی ہو۔ ایک اسلامی ریاست کے صدر کا کام بھی صحیح معنوں میں یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام و فرامین پر

عمل در آمد کرے۔ قرآن بلکہ اسلام اس تصور سے قطعاً نا آشنا ہے کہ ایک آدمی تمام مسلمانوں کے لیے قانون وضع کرے۔ قرآن مجید تکرار اور باصرار اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ اور صرف اللہ ہی دنیا و آخرت کا بادشاہ ہے اور اس کے احکام آخری اور قطعی ہیں۔ سورۃ ۶: آیت ۵۷؛ سورۃ ۱۲: آیت ۴۰ و ۶۷ میں فرمایا گیا ہے کہ حکمران صرف اللہ ہے۔ اسی طرح سورہ ۴۰: آیت ۱۲ میں فرمایا گیا ہے:

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ پس فیصلہ اللہ کے لیے ہے جو برتر اور بزرگ ہے۔

یہ بات سورۃ ۵۹: آیت ۲۳-۲۴ سے بھی واضح ہے کہ حاکمِ اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

وہی اللہ ہے کہ نہیں کوئی الٰہ سوا اس کے۔ بادشاہ ہے، پاک ہے، سلامتی والا ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، زبردست ہے، غالب ہے اور بڑائی والا ہے۔ پاک ہے اُس سے جسے وہ شریک کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے، خالق ہے بنانے والا ہے، صورت گری کرتا ہے۔ اُس کے لیے ہیں اچھے نام۔ پاکیزگی بیان کرتی ہے اس کی ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہ زبردست دانا ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چاروں خلفاء کا عمل اس بات کی واضح شہادت فراہم کرتا ہے کہ بادشاہت اسلام کے قطعاً منافی ہے، ورنہ اُن کے لیے اس سے آسان تر بات کوئی نہیں تھی کہ وہ مسلمان قوم کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیتے۔ اگر وہ ایسا کر دیتے تو ان کے دعوے کو فوراً تسلیم کر لیا جاتا کیونکہ ان کی صلاحیت، دیانت اور استقامت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ نہ یہ یقین رکھتے تھے اور نہ اس کا اعلان

ہی کرتے تھے کہ وہ اسلامی دنیا کے خود مختار اور مطلق العنان فرمانروا ہیں۔ وہ جو کام بھی کرتے تھے، دوسرے مسلمانوں کے باہمی مشورے سے کرتے تھے۔ تمام مسلمان ایک ہی برادری میں شریک تھے جو ان کے یا دوسرے لفظوں میں اسلامی عقیدے کا لازمی تقاضا تھا۔ اس عقیدے کا عین مزاج یہ تھا کہ انسان پر سے انسان کی فوقیت کا خاتمہ ہوگیا اور اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل کے لیے دروازہ کھل گیا۔ نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی محکوم۔ نہ کوئی پروہت تھا نہ کوئی پیر۔ ہر شخص امام بن سکتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اُسے اُن لوگوں کی پیروی کرنی پڑتی تھی جو تقویٰ یا کسی دوسرے لحاظ سے اُس پر فائق تھے۔ امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اخوتِ اسلام پر ایک کاری ضرب لگائی اور اپنے لڑکے کو ریاست کا جانشین نامزد کرکے پوری قوم کو اپنے خاندان کے عوض میں گرو کر دیا۔ ہمارے جمہوریت پسند رسول کی وفات کے جلد ہی بعد اسلام کی لائی ہوئی جمہوریت کو امپیریلزم میں تبدیل کر دیا گیا۔ معاویہ نے نسلی خلافت کا آغاز کرکے اسلام کی جڑ پر تیشہ رکھ دیا۔ محمد رسول اللہ اگرچہ اپنے بعض قرابت داروں سے بڑی محبت رکھتے تھے، لیکن انہوں نے ان میں سے کسی کو بھی اپنے بعد امتِ مسلمہ کا سربراہ مقرر نہیں کیا۔ ہمیشہ آپ کی روش نمایاں طور پر جمہوری رہی۔ معاویہ کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے نے ان کے حسبِ نشا خلافت پر غاصبانہ قبضہ جما لیا اور خود نبی کے نواسے نے یزید کی اس خلاف ورزیٔ قرآن کا سدّباب کرنے کے لیے اپنی اور اپنے عزیزوں کی جانوں کو قربان کر دیا۔ یہ بنو امیہ کا پراپیگنڈا تھا کہ امام حسین نے اپنی جان اس لیے دی تاکہ وہ خلافت کے حق کو اہلِ بیت کے لیے محفوظ کر سکیں۔ یہ پراپیگنڈا بالکل جھوٹا تھا اور یہ عجیب بات ہے کہ شیعہ حضرات بھی اسی پراپیگنڈے کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے امام حسین کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہت اور استبداد مسلمانوں کے اندر ایک مسلّم قاعدے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لیے اپنے امیر کے انتخاب میں کوئی اختیار باقی نہ رہا اور اپنے معاملات کے کنٹرول میں ان کا کوئی دخل نہ رہا۔ معاویہ نے جس کام کا آغاز کیا اُس کا شاید کوئی فوری خراب نتیجہ برآمد نہ ہُوا، لیکن آخرکار اس نے مسلم

سوسائٹی کے صحت مندانہ ارتقا اور نشو و نما کو ناگزیر طور پر متاثر کیا اور آج اقوامِ عالم کی برادری میں اس کی حیثیت ثانوی بن کر رہ گئی ہے۔

۱۰۔ قرآن مجید کی رُو سے مسلمانوں کا امیر صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو علمی اور جسمانی حیثیت سے اس منصب کے لیے موزوں ہو۔ اس سے صاف طور پر امارت کی نسلی بنیاد کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس معاملے میں مندرجہ ذیل آیات کا نقل کرنا مفید ہو گا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔

ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ بولے "ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا۔ حالانکہ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے۔" نبی نے کہا "اللہ نے تمہارے مقابلے میں اس کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی اور جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے۔ اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

۱۱۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اسلامی قانون کے ٹھیک مطابق قانون سازی اللہ اور صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ آدم سے لے کر اب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین اپنے انبیاء اور رسولوں کے ذریعے سے نافذ فرمائے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اللہ کی حکمت بالغہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو آخری شریعت عطا کی جائے۔ یہ قانونِ شریعت انسانوں کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کی شکل میں نازل ہوا۔ یہ وحی لکھ لی گئی یا زبانی

یاد کر لی گئی اور بعد میں اسے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا گیا جو قرآن مجید کے نام سے معروف ہے۔ اس کے بعد نسلِ انسانی کے تمام مردوں، عورتوں اور بچوں کے معاملات کا تصفیہ ان احکام کی روشنی میں کیا جانا تھا جو اللہ نے قرآن میں ارشاد فرماتے۔ یہی احکام بتاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے، کیا پسندیدہ ہے اور کیا غیر پسندیدہ ہے، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کیا مستحب ہے اور کیا مکروہ ہے۔ غرض قرآن مجید مسلم معاشرے کی ایک لازمی بنیاد ہے۔ یہ وہ مرکز و محور ہے جس کے گرد پورا اسلامی قانون گردش کرتا ہے۔

۱۱ - (د) یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں پر مشتمل سوسائٹی ایک نہایت پیچیدہ شے ہے۔ اگرچہ فطرت ابدی و ازلی ارادے کے اظہار کا نام ہے اور یہ ایک ابدی قانون کے تابع ہے لیکن انسانی احوال و کوائف ہر زمانے اور ہر مقام کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ شخصیات اور مادی حالات کا اجتماع مستقبل کے واقعات کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ انسان کے ہزار گونہ معاملات ہیں جن میں ہزار گونہ حالات و کوائف سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اللہ کی مشیت یہ ہے کہ ہر بچہ جو دنیا میں آئے، اپنے ساتھ خیالات کی ایک نئی دنیا لائے۔ ہر طلوع ہونے والا دن نئے اور غیر متوقع تغیرات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں، اس لیے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل، ناقابلِ تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ قرآن مجید بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے مختلف معاملات میں چند وسیع اور عام قاعدے انسانی ہدایت کے لیے دے دیئے ہیں۔ یہ ہمیں مجرد قواعد کا ایک کامل ترین نظام اور خیر و صلاح پر مبنی ایک ضابطۂ اخلاق دیتا ہے۔ بعض خاص معاملات (مثلاً وراثت) میں یہ زیادہ واضح اور مفصل ہے۔ بعض امور ایسے ہیں جن کا ذکر تمثیل و تلمیح کے انداز میں کیا گیا ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جن میں قرآن نے مکمل سکوت اختیار کیا ہے تاکہ ان معاملات میں انسان اپنا طرزِ عمل زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق متعین کرے۔ قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور

دیا گیا ہے کہ یہ نہایت سادہ زبان میں نازل کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک اسے سمجھ سکے۔ بعض آیات جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے ان کا یہاں نقل کر دینا مفید ثابت ہوگا۔

[اس کے بعد فاضل جج نے سورہ ۲ آیت ۲۴۲، سورہ ۶: آیت ۹۹، سورہ ۶: آیت ۱۰۶، سورہ ۶: آیت ۱۲۷، سورہ ۱۱: آیت ۱، سورہ ۱۲: آیت ۲، سورہ ۱۵: آیت ۱، سورہ ۱۷: آیت ۸۹، سورہ ۱۷: آیت ۱۰۶، سورۃ ۳۹: آیت ۲۸، سورہ ۵۴ آیت ۱۷، سورہ ۵۴: آیت ۲۲، سورہ ۵۷: آیت ۹، سورہ ۵۷: آیت ۱۷، سورہ ۵۷: آیت ۲۵، سورہ ۳۰: آیت ۵۸، سورہ ۴۱: آیت ۴۴ نقل کی ہیں، اور ان کا ترجمہ بھی ساتھ دیا ہے۔]

پس یہ امر بالکل واضح ہے کہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں ہے۔ قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ تاکہ تمام مسلمان اگر چاہیں تو اسے سمجھ سکیں اور اس کے مطابق عمل کر سکیں۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی فاضل یا عالی مقام کیوں نہ ہو وہ مسلمان سے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں چھین سکتا۔ قرآن مجید کو سمجھتے وقت ایک آدمی پرانے زمانے کے لائق مفسرین کی تفاسیر سے قیمتی امداد حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اس معاملے کو بس یہیں تک رہنا چاہیے۔ ان تفسیروں کو اپنے موضوع پر حرفِ آخر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا خود اس امر کو متضمن ہے کہ آدمی اس کی تعبیر کرے اور اس کی تعبیر کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آدمی اس کو وقت کے حالات پر اور دنیا کی بدلتی ہوئی ضروریات پر منطبق کرے۔ اس مقدس کتاب کی جو تعبیریں قدیم مفسرین، مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی وغیرہ نے کی ہیں جن کا تمام مسلمان اور میں خود بھی انتہائی احترام کرتا ہوں، وہ آج کے زمانے میں جوں کی توں نہیں مانی جا سکتیں۔ ان کی تعبیرات کو درحقیقت دوسرے بہت فضلاء نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے جن میں ان کے اپنے شاگرد بھی شامل ہیں۔ قرآن مجید کے

مختلف ارشادات کا جو غائر مطالعہ ان حضرات نے کیا تھا وہ ہم پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ اُن گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے ہیں جو اس زمانے میں ماحول پر طاری تھے، وہ ان مسائل کے بارے میں ایک خاص نتیجے تک پہنچے ہیں جو ان کے اپنے ملک یا زمانے میں درپیش تھے۔ آج سے بارہ یا تیرہ سو برس پہلے کے مفسّرین کے اقوال کو حرفِ آخر مان لیا جائے تو اسلامی سوسائٹی ایک آہنی قفس میں بند ہو کر رہ جائے گی اور زمانے کے ساتھ ساتھ نشو و نما کا اُسے موقع نہیں ملے گا۔ یہ پھر ایک ابدی اور عالمگیر دین نہیں رہے گا بلکہ جس زمان و مکان میں اس کا نزول ہوا تھا یہ اسی تک محدود رہے گا جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ اگر قرآن کوئی مگے بندھے ضوابط مقرر نہیں کرتا، تو امام ابوحنیفہ وغیرہ کی تشریحات کو بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ بالواسطہ اسی نتیجے کا باعث بنیں۔ بدقسمتی سے حالاتِ جدیدہ کی روشنی میں قرآن مجید کی تفسیر کا دروازہ چند صدیوں سے بالکل بند کر دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان مذہبی جمود، تہذیبی انحطاط، سیاسی پژمردگی اور معاشی زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔ سائنٹفک ریسرچ اور ترقی جو ایک زمانے میں مسلمانوں کا اجارہ تھی وہ دوسروں کے ہاتھوں میں جا چکی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان ہمیشہ کی نیند سو گئے ہیں۔ اس صورتِ حال کا خاتمہ لازمی ہے۔ مسلمانوں کو بیدار ہو کر زمانے کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اجتماعی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے جو بے حسی اور بے عملی مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے اُس سے نجات حاصل کرنی پڑے گی۔ قرآن مجید کے عام اصولوں کو سوسائٹی کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر منطبق کرنے کے لیے ان کی ایسی معقول اور دانشمندانہ تعبیر کرنی ہوگی کہ لوگ اپنی تقدیر اور اپنے خیالات اور اخلاقی تصورات کی تشکیل اس کے مطابق کر سکیں اور اپنے ملک اور زمانے کے لیے موزوں طریقے پر کام کر سکیں۔ دوسرے انسانوں کی طرح مسلمان بھی عقل اور ذہانت رکھتے ہیں اور یہ طاقت استعمال کرنے ہی کے لیے دی گئی ہے، بیکار ضائع ہونے کے لیے نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں عوام کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اس بات پر غور و خوض

اور تحقیق کریں کہ نصوص قرآنی کا مدعا اور مفہوم عند اللہ کیا ہے اور اسے اپنے مخصوص احوال پر کس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ پس تمام مسلمانوں کو قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس کی تعبیر کرنا ہوگا۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۔ (اور ان میں سے وہ ہیں جو تمہاری بات تبکلف سنتے ہیں یہاں تک کہ جب وہ تمہارے پاس سے نکل جاتے ہیں تو وہ ان لوگوں سے جنہیں علم دیا گیا ہے کہتے ہیں" کیا کہا ہے اُس نے ابھی ؟" یہی لوگ ہیں جن کے دل پر اللہ نے ٹھپا لگا دیا ہے اور انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے)۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۔ (وہی ہے جس نے پیدا کیا اُمیوں میں ایک رسول ان میں سے جو تلاوت کرتا ہے ان پر اُس کی آیات اور انہیں پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت، حالانکہ وہ پہلے یقیناً کھلی ہوئی گمراہی میں تھے)۔

لوگوں پر لازم ہے کہ وہ قرآن میں تدبر کریں اور اپنے دلوں پر قفل نہ لگا دیں۔

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ (یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، برکت والی ہے تا کہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقلمند نصیحت حاصل کریں)۔

لوگوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن میں غور و فکر کریں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جس طرح دنیا میں دیگر مقاصد کے حصول کی خاطر سخت جد و جہد کی ضرورت ہے، اسی طرح قرآن کو سمجھنے اور اس کے مدعا کو پانے کی سخت کوشش ہی کا نام اجتہاد ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (جو کوئی سخت جدّ جہد

کرتا ہے وہ اپنی جان کے لیے جد وجہد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بے نیاز ہے جہان والوں سے)۔

دوبارہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگ قرآن مجید کا مکمل اور صحیح علم حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ حَتّٰىٓ اِذَا جَاۗءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (یہاں تک کہ جب وہ آجائیں گے وہ کہے گا: کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا، حالانکہ تم نے علم سے ان کا احاطہ نہیں کیا، یا تم کیا کر رہے تھے؟)

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (اور سخت کوشش کرو اللہ کی راہ میں جیسا کہ اس کے لیے کوشش کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چنا ہے اور نہیں بنائی تم پر دین کے معاملے میں تنگی، طریقہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا، اس نے نام رکھا تمہارا مسلمین پہلے اور اس میں، تاکہ رسول تم پر گواہ بنے اور تم لوگوں پر گواہ ہو، پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو وہ تمہارا حامی و نگہبان ہے پس کیا ہی اچھا حامی اور کیا ہی اچھا مددگار ہے)۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا (پس بہت بلند و برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی اور نہ جلدی کرو قرآن کے ساتھ قبل اس کے کہ پوری ہو جاتے تمہاری طرف وحی اُس کی اور کہو اے رب میرے، بڑھا مجھے علم میں)۔

یہ تمام آیات اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ تمام مسلمانوں سے، نہ کہ ان کے کسی خاص طبقے سے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کریں، اسے اچھی طرح سمجھیں اور اس کی تعبیر کریں۔ تشریح و تعبیر کے لیے چند مسلّم اصولوں کی پابندی لازم ہے۔ ان اصولوں میں سے چند ایک یہ ہو سکتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کے بعض احکام اہم اور بنیادی ہیں۔ ان کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان پر جُوں کا توں عمل کرنا چاہیے۔

(۲) کچھ اور آیات ایسی ہیں جن کی نوعیت ہدایات کی ہے اور جن کی پیروی کرنا کم و بیش ضروری ہے۔

(۳) جہاں الفاظ بالکل سادہ اور واضح ہوں، جو متعین اور غیر مبہم مفہوم پر دلالت کرتے ہوں وہاں الفاظ کے وہی معانی مراد لینے چاہییں جو لغت اور گرامر کی رُو سے صحیح اور ٹھیٹھ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اس مقدس کتاب کے الفاظ کے ساتھ کسی طرح کی کھینچ تان روا نہیں ہے۔

(۴) اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ بے معنی، متناقض یا زائد از ضرورت نہیں ہے۔

(۵) سیاق و سباق سے الگ کر کے کوئی معنی نہیں نکالنے چاہییں۔

(۶) شانِ نزول کے مطابق یعنی نزولِ قرآن کے وقت جو حالات درپیش تھے ان کے پس منظر میں رکھ کر قرآن کے معانی کی تشریح کرنا خطرناک ہے۔

(۷) قرآن کی تعبیر معقول (RATIONAL) ہونی چاہیے۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ اسے گرد و پیش کے احوال سے متاثر ہونے والے انسانی رویّے سے متطابق ہونا چاہیے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ نئے اور غیر متوقع حالات ہمیشہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ سوسائٹی کی ضروریات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اور تشریح ان حالات و مقتضیات کی روشنی میں کی جانی ضروری ہے۔

(۱۱) زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر جو مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں ان میں مشابہت و عدم مشابہت کا باہمی موازنہ ہونا چاہیے۔ تقابل کرتے ہوئے ہمیں حالات و درجات کی رعایت کو ملحوظ رکھنا چاہیے اور بعید و قریب کے حقائق کو جانچتے ہوئے ماضی سے حال کی جانب اس طرح پیش قدمی کرنی چاہیے کہ مفروضات و قیاسات اور غیر مطلق اور قابلِ ترک اعتقادات سب ہماری نگاہ کے سامنے رہیں۔

۱۲۔ بدقسمتی سے اس دنیا میں کم از کم خلافتِ راشدہ کے بعد، کوئی ایسی صحیح اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی جس میں لوگوں نے پورے شعور و ارادہ اور باہمی تعاون کے ساتھ قرآن مجید کی تعبیر کا کام کیا ہو۔ قرآن مجید کے مقرر کردہ اصول ابدی ہیں لیکن ان کا انطباق ابدی نہیں ہے کیونکہ انطباق ایسے حقائق و مقاصد کا مرہونِ منت ہے جو مسلسل تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اب اگر قرآن مجید کی ایک خاص نص کی ایک سے زاید تعبیرات ممکن ہوں اور ہر مسلمان کو اس بات کا حق دے دیا جائے کہ وہ اپنے فہم و ذوق کے مطابق تشریح کرے، تو اس کے نتیجے میں بے شمار تعبیرات وجود میں آکر ایک بدنظمی کا موجب بن جائیں گی۔ اسی طرح جن معاملات میں قرآن مجید ساکت ہے ان میں بھی اگر ہر شخص کو اس کے نقطۂ نظر کے موافق ایک ضابطہ بنانے کا اختیار دے دیا جائے تو ایک پراگندہ اور غیر مربوط سوسائٹی پیدا ہو جائے گی۔ ہر دوسری سوسائٹی کی طرح اسلامی سوسائٹی بھی کم سے کم زحمت دہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ افراد کو زیادہ سے زیادہ راحت و مسرت پیش کرتی ہے۔ اس لیے غلبہ اکثریت ہی کی رائے کو حاصل ہوگا۔

۱۳۔ ایک آدمی یا چند آدمی فطرۃً عقل اور قوت میں ناقص ہوتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی طاقتور اور ذہین ہو، اس کے کامل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک اعلیٰ درجے کا حساس اور صاحبِ نظر انسان بھی اپنے مشاہدے میں آنے والے جملہ امور کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ نہیں کر سکتا۔ لاکھوں کروڑوں آدمی جو اجتماعی زندگی ایک نظم کے ساتھ بسر کر رہے ہیں اپنی اجتماعی حیثیت میں افراد کی بہ نسبت زیادہ عقل اور طاقت رکھتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ اور قوتِ متخیلہ مقابلۃً بہتر اور برتر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے بھی کتاب اللہ کی تعبیر اور حالات پر اس کے عام اصولوں کا انطباق ایک آدمی یا چند آدمیوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ بلکہ یہ کام مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (وہ جنہوں نے اپنے رب کے بلاوے کا جواب دیا اور نماز قائم کی اور ان کا کام باہمی

مشورے سے ہوتا ہے اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں)۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ۔ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۔ (اور اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامے رہو سب، اور تفرقہ مت پیدا کرو اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہوئی جب تھے تم دشمن، پس اُس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور ہو گئے تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی۔ اور تھے تم آگ کے گڑھے کے کنارے پس بچا یا اُس نے تم کو اس سے۔ اس طرح واضح کرتا ہے اللہ تمہارے لیے اپنی آیات، شاید کہ تم ہدایت پاؤ)۔

اور بہت سی آیات میں بھی مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ قرآن مجید کو سمجھنے کی اور اس کی آیات پر غور و فکر کرنے کی کوشش کریں۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ یہ کام انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی طور پر سرانجام دیا جانا چاہیے۔

۱۴:- اس سیاق و سباق کے اندر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ "قانون" کے لفظ کے معنی کیا ہیں؟ میری رائے میں قانون سے مراد وہ ضابطہ ہے جس کے متعلق لوگوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہو کہ ان کے معاملات اس کے مطابق چلنے چاہییں۔

۱۵- ابتدا میں نسلِ انسانی کی تعداد بہت قلیل اور منتشر تھی اور ان میں سے ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر سکتا تھا۔ بعد میں جب انسانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور انہیں گروہوں کی شکل میں بسنے کی ضرورت پیش آئی، اس وقت اُن کے لیے ایک مشترک ضابطۂ اخلاق کی حاجت بھی رونما ہوتی۔ مثال کے طور پر پچاس آدمیوں کی ایک جماعت میں قتل کا ارتکاب کیا گیا۔ اکثریت کے خیال کے مطابق یہ ایک غلط اور ناجائز کام تھا۔ چند افراد کے نزدیک شاید ایسا نہیں تھا۔ چونکہ اکثریت کے پاس طاقت تھی، اس لیے انہوں نے اپنی مرضی کو اقلیت پر بجبر نافذ کر دیا اور اسی کو قانون کا درجہ حاصل ہو گیا، گویا کہ ان پچاس آدمیوں میں سے کوئی

بھی قتل کا مرتکب نہیں ہوگا۔ یہ استدلال آج کل کے حالات کے لحاظ سے بھی صحیح ہے۔ کئی کروڑ باشندوں کے ایک ملک میں باشندوں کی اکثریت کو قرآن کی اُن آیات کی جن کے اندر دو یا زائد تعبیروں کی گنجائش ہو۔ ایسی تعبیر کرنی چاہیے جو ان کے حالات کے لیے موزوں ترین ہو اور اسی طرح قرآن کے عام اصولوں کو حالاتِ موجودہ پر منطبق کرنا چاہیئے تاکہ فکر و عمل میں یکسانی و وحدت پیدا ہو سکے۔ اسی طرح یہ اکثریت کا کام ہے کہ ان مسائل و معاملات میں جن پر قرآن ساکت ہے، کوئی قانون بنائے۔ اس کے بعد جو سوال بحث طلب ہے وہ یہ ہے کہ کروڑوں انسان قرآن مجید کی تعبیر و انطباق اور مسکوت عنہا معاملات میں قانون سازی کے حق کو کس طرح استعمال کریں گے؟ ایک ملک کے حالات کو دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں کے باشندوں کے لیے اپنے نمائندوں کو منتخب کرنے کی بہترین صورت کیا ہے جنہیں وہ اعتماد کے ساتھ اپنے اختیارات اور اظہار رائے کے حقوق تفویض کر سکیں۔ وہ فرد واحد کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے ہیں۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک شخص کو مختارِ مطلق بنا دینے کے نتائج ہمیشہ مہلک ثابت ہوئے ہیں۔ اقتدار کا نشہ فرد، جماعت اور قانون کی حکمرانی میں اختلال اور بگاڑ کا موجب ہوتا ہے اور جہاں اقتدار بلا قید اور مطلق ہو وہاں یہ سہ گونہ فساد بھی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک ملک کی تاریخ میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جو ایک شخص کو مجبور کر دیں کہ وہ اصلاحِ احوال اور ملک کو تباہی سے بچانے کی خاطر عنانِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن یہ ایک ہنگامی صورت ہے جو جمہوریت کو بحال کرنے اور اختیارات کی امانت کو عوام کی طرف لوٹانے کے لیے قطعی طور پر جائز ہے۔ اس لیے صحیح اسلامی قانون کے مطابق اس امر کی بڑی اہمیت ہے کہ اختیارات متعدد افراد کے اندر منقسم ہوں تاکہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے روک تھام اور احتساب کا باعث ہو اور سب مل جُل کر پوری قوم کی رہنمائی کے لیے قوانین و ضوابط وضع کر سکیں۔ حالات کا قدرتی اقتضاء یہ ہے کہ یہ جملہ با اختیار افراد عوام الناس کے سامنے مسئول اور جوابدہ ہوں۔ صرف اسی صورت میں ہی ایک منظم طریق کار کے ساتھ کسی

پروگرام کو کامیابی کے مراحل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اسلام میں سارے مسلمان اقتدار کے یکساں طور پر حامل ہیں اور ان پر صرف اللہ کی بالادستی ہے۔ ان کے فیصلے آزاد شہریوں کی حیثیت سے اجتماعی اور مشترک طور پر کیے جاتے ہیں۔ اسی کا نام "اجماع" ہے۔

"اجتہاد" قانون کا ایک مسلّم مآخذ ہے۔ اس سے مراد کسی مشتبہ یا مشکل قانونی مسئلے میں رائے قائم کرنے کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو مکمل طور پر مصروفِ کار کرنا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے بڑے وسیع پیمانے پر "اجتہاد" کا استعمال کیا ہے۔ "اجتہاد" کی جن مختلف صورتوں کو امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہاء کام میں لاتے ہیں وہ یہ ہیں: قیاس، استحسان، استصلاح اور استدلال۔ مسلمان فقیہ فردِ واحد یا چند افراد کے لیے "اجتہاد" کو خطرناک سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اس بات کو قابلِ ترجیح خیال کرتے تھے کہ کسی خاص قانونی مسئلے میں فقہاء اور مجتہدین کے اجماع یا کثرتِ رائے سے فیصلہ ہو۔ قدیم زمانے میں تو شاید یہ درست تھا کہ اجتہاد کو چند فقہاء تک محدود کر دیا جائے، کیونکہ لوگوں میں آزادانہ اور عمومیت کے ساتھ علم نہیں پھیلایا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ فریضہ باشندوں کے نمائندوں کو انجام دینا چاہیے، کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، قرآن مجید کا پڑھنا اور سمجھنا اور اس کے عام اصولوں کو حالات پر منطبق کرنا ایک یا دو اشخاص کا مخصوص استحقاق نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کا حق اور فرض ہے اور یہ کام ان لوگوں کو انجام دینا چاہیے جنہیں تمام مسلمانوں نے اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہو۔ لہٰذا یہ بات آپ سے لازم آتی ہے کہ جن معاملات میں قرآن مجید کا حکم واضح ہو، وہ مسلمانوں کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے اور جہاں تک قرآن مجید کی تعبیر اور اس کے عمومات کو جزئیات پر چسپاں کرنے کا تعلق ہے، ان میں جو کچھ عوام کے منتخب نمائندے [illegible] اسے بھی قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔

۱۶۔ اوپر جو نقطۂ نظر بیان کیا گیا ہے اسے چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ میں پہلے قرآن مجید کی سورۂ نساء کی تیسری آیت کو لوں گا جسے اکثر غلط استعمال کیا گیا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَلَّا تَعُوْلُوْا (اور اگر تم ڈرو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کر و گے تو نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں عورتوں سے دو دو، تین تین، چار چار۔ پھر اگر تم ڈرو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی سہی یا جن کے مالک ہیں تمہارے سیدھے ہاتھ۔ اس سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی نہ کرو گے)۔

جیسا کہ میں اپنے فیصلے کے ابتدائی حصے میں بیان کر چکا ہوں، قرآن مجید کے کسی حکم کا کوئی جزء بھی فضول یا بے معنی نہ سمجھا جانا چاہیے۔ لوگوں کے منتخب نمائندوں کا کام ہے کہ وہ اس بارے میں ایک قانون بنائیں کہ آیا ایک مسلمان ایک سے زائد بیویاں کر سکتا ہے یا نہیں اور اگر کر سکتا ہے تو کن حالات میں اور کن شرائط کے ساتھ۔ از راہ قیاس ایسی شادی کو یتیموں کے فائدے کے لیے ہونا چاہیے۔

۱۷- بہر کیف اس آیت سے صرف جواز ثابت ہوتا ہے نہ کہ لزوم اور میری دانست میں ریاست اس اجازت کو محدود کر سکتی ہے۔ اگر پچاس آدمیوں کی جماعت میں سے اکثریت یہ قانون بنا سکتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی قتل کا ارتکاب نہیں کرے گا، تو اس مثال پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ کہے کہ "میں ایک سے زیادہ بیویاں نہیں کروں گا، کیونکہ میں اس کی استطاعت نہیں رکھتا" تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اکثریت بھی ساری قوم کے لیے یہ قانون بنا سکتی ہے کہ قوم کی معاشی تمدنی یا سیاسی حالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اس کا کوئی فرد ایک سے زیادہ بیویاں کرے۔ اس آیت کو قرآن مجید کی دو دوسری آیات کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیے۔ پہلی آیت سورہ ۲۴ کی آیت ۳۳ ہے جس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ جو لوگ شادی کرنے کے ذرائع نہ رکھتے ہوں ان کو شادی نہ کرنی چاہیے۔ اگر ذرائع کی کمی کے باعث ایک شخص کو

ایک بیوی کرنے سے روکا جا سکتا ہے تو انہی وجوہ یا ایسے ہی وجوہ کی بنا پر اسے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے روک دیا جانا چاہیے۔ شادی بیوی اور بچوں کے وجود پر متضمن ہے۔ اگر خاندان کی عدمِ کفالت کی صورت میں ایک شخص کے لیے نکاح ممنوع ہو سکتا ہے تو اسے امر پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنے ہی بچے پیدا کرے، جتنے پال سکے۔ اگر وہ خود تحدیدِ نسل نہ کر سکے تو ریاست کو اُس کے لیے یہ کام کرنا چاہیے۔ اس اصول کا وسیع پیمانے پر اطلاق کرتے ہوتے۔ مثلاً اگر کسی ملک کی غذائی حالت خراب ہو اور برتھ کنٹرول کی حاجت ہو تو ریاست کے لیے یہ قانون بنانا بالکل جائز ہوگا کہ کوئی شخص ایک سے زائد بیوی نہ رکھے اور ایک بھی صرف اس صورت میں رکھے جبکہ وہ اپنے کنبے کی ضروریات فراہم کر سکتا ہو اور بچے بھی ایک خاص حد تک رکھے۔ مزید برآں آیت مذکورۂ بالا میں خاص طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایک مسلمان ڈرتا ہو کہ وہ دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکے گا، تو وہ صرف ایک بیوی سے شادی کرے۔ آگے سورہ ۴، آیت ۱۲۹ میں اللہ نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرنا انسانی ہستیوں کے بس میں نہیں ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا اَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَاِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ (تم ہرگز یہ استطاعت نہیں رکھتے کہ عدل کر سکو عورتوں کے درمیان خواہ تم اس کے کیسے ہی خواہشمند ہو۔ پس ایک سے کامل بے رخی اختیار نہ کرو کہ اُسے ایسا چھوڑ دو جیسے وہ لٹکی ہوئی چیز ہو، اگر تم اصلاح کرو اور بچو بُرائی سے، تو یقیناً اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)۔

یہ ریاست کا کام ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تطبیق دینے کے لیے ایک قانون بنائے اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے پر پابندیاں عائد کرے۔

۱۸۔ ریاست یہ کہہ سکتی ہے کہ دو بیویاں کرنے کی صورت میں چونکہ سالہا سال کے تجربات سے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے، اور قرآن میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ دونوں بیویوں کے

ساتھ یکساں برتاؤ ناممکن ہے، لہٰذا یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے ۔ یہ تین آیات عام اصول بیان کرتی ہیں۔ ان عام اصولوں کا انطباق ریاست کو اپنی نگرانی میں کرنا چاہیے ریاست لوگوں کو ایک سے زیادہ شادی کر کے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو تباہ کرنے سے بچا سکتی ہے ۔ قومی اور ملکی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ جب کبھی ضرورت محسوس ہو شادی پر پابندی عائد کر دی جائے ۔

۱۹ - چوری کے معاملے میں سورہ ۵، آیت ۳۸ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ چور مردوں اور چور عورتوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں ۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے جرم کی عبرتناک سزا ہے اسی سورۃ کی آیت ۳۹ یہ بتاتی ہے " جو کوئی اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو یقیناً اللہ اُس کی توبہ قبول کرتا ہے " پس عام اصول یہ ہے کہ چوری کی زیادہ سے زیادہ سزا قطع ید ہے لیکن یہ طے کرنا ریاست کا کام ہے کہ چوری کیا ہے اور کونسی چوری کی کیا سزا ہے؟ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریاست کو لوگوں کے لیے قرآنی احکام پر مبنی قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار حاصل ہے ۔ یہ اختیارات بہت وسیع ہیں اور منظم عملی پروگرام نافذ کرنے کے لیے ان کا آزادانہ استعمال ہونا چاہیے ۔

۲۰ - ہند و پاکستان میں فقہی کتابیں بھی قانونی لحاظ سے مستند تسلیم کی جاتی ہیں، ان میں اولادِ صغار کے متعلق بیان کردہ اصول قرآن مجید پر مبنی نہیں ہیں۔ اس مقدس کتاب میں جو احکام نابالغ بچوں سے متعلق ہیں ان میں سے چند یہاں نقل کیے جا رہے ہیں :

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا

تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال اس کے لیے جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے اور باپ کے ذمے ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا معروف طریق پر کسی جان کو تکلیف نہ دی جاتے مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ نہ والدہ کو ضرر پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ والد کو، اور وارث کے ذمے بھی اسی کی مانند ہے۔ پس اگر دونوں دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو کوئی گناہ نہیں ان پر اور اگر تم چاہو کہ دوسری عورت سے دودھ پلاؤ اپنے بچوں کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر جب کہ تم نے جو کچھ طے کیا ہے وہ معروف طریقے پر حوالے کر دو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اُسے دیکھنے والا ہے)۔

اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ ؕ وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَـكُمۡ فَاٰ تُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ ۚ وَاۡتَمِرُوۡا بَيۡنَكُمۡ بِمَعۡرُوۡفٍ ۚ وَاِنۡ تَعَاسَرۡتُمۡ فَسَتُرۡضِعُ لَهٗۤ اُخۡرٰى (انہیں جہاں تم ٹھہرے ہو اپنے وسائل کے مطابق اور انہیں نقصان نہ پہنچاؤ تاکہ ان پر تنگی کرو اور اگر حمل والی ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ وضع حمل ہو جائے پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو دو انہیں ان کے معاوضے اور مشورہ کر لو آپس میں معروف کے مطابق اور اگر باہمی اختلاف ہو تو دوسری عورت اُسے دودھ پلائے)۔

ان آیات کی رو سے ماؤں کو پورے دو سال تک بچوں کو دودھ پلانا ہو گا۔ باپ کو سارے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے جن میں نظر بظاہر بچے اور والدہ دونوں کے اخراجات شامل ہیں۔ اس سے شیعہ قانون کی تائید ہوتی ہے جس کی رو سے لڑکے کے معاملے میں والدہ کا حق حضانت دو سال ہے۔ لیکن حضانت کے مسئلے میں لڑکے اور لڑکی کے مابین جو تمیز قائم کی جاتی ہے، اس کے حق میں مجھے تو ان سے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں ہو سکی۔ قرآن مجید والدین میں سے ہر دو پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ بچے کی پرورش کریں۔ بچے سے محروم نہ

والد کو کیا جا سکتا ہے اور نہ والدہ کو۔ بہرکیف قرآن مجید میں ایسی کوئی ہدایت نہیں کہ ایک عورت طلاق پاکر اگر دوسری شادی کرلے تو پہلا شوہر اس سے اپنا بچہ لے سکتا ہے۔ اگر محض اس بنا پر کہ اس نے دوسری شادی کرلی ہے، وہ بچہ سے محروم ہو سکتی ہے تو میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ ایک مرد دوسری شادی کر لینے کی صورت میں کیوں نہ اپنے بچے سے محروم ہو۔ سوتیلی ماں اگر سوتیلے باپ سے زیادہ نہیں تو کم ازکم اُس کے برابر تکلیف دہ اور خطرناک ضرور ہے۔ بہرحال نابالغوں کے متعلق قانون بنانا ریاست کا کام ہے کیونکہ قرآن اس بارے میں قطعًا ساکت ہے۔ گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ کے بارے میں یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ نابالغان کے معاملات اس کے تابع ہیں۔ پاکستان کی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد ملک کے منتخب نمائندوں نے اس قانون کو منظور کرلیا تھا۔ لیکن اس قانون میں بھی اس بارے میں کوئی واضح اور متعین ضابطہ نہیں ہے کہ والدہ کے نکاح ثانی کے بعد نابالغ بچے کا حق حضانت کسے حاصل ہوگا۔ قرآن اور اس ایکٹ دونوں کے مطابق واحد قابلِ لحاظ امر بچے کی فلاح وبہبود ہے۔ اگر بچے کی فلاح وبہبود کا تقاضا یہ ہو کہ بچہ والدہ کے پاس رہے، تو والدہ کے نکاح ثانی کے باوجود بچہ اسی کی تحویل میں رہنا چاہیے۔ ہر مقدمے کا فیصلہ اس کے خاص حالات وکوائف کی بنا پر ہوگا۔

۱۲۔ قرآن کے علاوہ حدیث یا سنت کو بھی مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اسلامی قانون کا ایک اتنا ہی اہم ماخذ سمجھ لیا ہے۔ متعین مفہوم کے مطابق حدیث سے مراد محمد رسول اللہ کا قول ہے۔ لیکن عام طور پر حدیث سے مراد رسول کا قول وعمل لیا جاتا ہے جسے آپ نے پسند یا ناپسند فرمایا یا ناپسند نہیں فرمایا۔ اسلامی قانون کا ماخذ ہونے کی حیثیت سے حدیث کی قدروقیمت کیا ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ رسول پاک کا مرتبہ ومقام اسلامی دنیا میں کیا ہے؟ میں اس فیصلے کے ابتدائی حصہ میں یہ بتا چکا ہوں کہ اسلام ایک خدائی دین ہے۔ یہ اپنی سند خدا اور صرف خدا ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اگر یہ اسلام کا صحیح تصور ہے تو اس سے لازمًا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی کے اقوال واعمال اور کردار

کو خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کی سی حیثیت نہیں دی جاسکتی ۔ زیادہ سے زیادہ ان سے یہ معلوم کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے کہ مخصوص حالات میں قرآن کی تعبیر کس طرح کی گئی تھی، یا ایک خاص معاملہ میں قرآن کے عام اصولوں کو خاص واقعات پر کس طرح منطبق کیا گیا تھا ۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محمد رسول اللہ ایک کامل انسان تھے ۔ نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ جس عزت و تکریم کے مستحق ہیں یا جس عزت و تکریم کا ہم ان کے لیے اظہار کرنا چاہتے ہیں، اس کے اظہار کی قوت و قابلیت وہ رکھتا ہے ۔ لیکن با ایں ہمہ وہ خدا نہ تھے، نہ خدا سمجھے جاسکتے ہیں ۔ دوسرے تمام رسولوں کی طرح وہ بھی انسان ہی ہیں ۔ (اس کے بعد فاضل جج نے سورۃ ۱۲: آیت ۱۰۹، سورۃ ۱۴: آیت ۱۰، ۱۱، سورۃ ۳: آیت ۱۴۴، سورۃ ۷: آیت ۱۸۸، سورۃ ۴۱: آیت ۶، سورۃ ۱۸: آیت ۱۵ مع ترجمہ نقل کی ہیں ۔ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا ذکر ہے ۔ اس کے بعد فاضل جج فرماتے ہیں):

اُن کو اللہ کے احکام کی پابندی اسی طرح کرنی پڑتی تھی جس طرح ہمیں کرنی پڑتی ہے، بلکہ شاید اُن کی ذمہ داریاں قرآن مجید کی رُو سے ہماری ذمہ داریوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ تھیں ۔ وہ مسلمانوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں دے سکتے تھے جتنا کچھ کہ اُن پر نازل ہوا تھا ۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (اے رسولؐ پہنچا دو جو کچھ نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اور اگر تم ایسا نہیں کروگے تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تمہیں بچائے گا لوگوں سے ۔ یقیناً اللہ نہیں ہدایت دیتا کافروں کی قوم کو) ۔

۲۲ ۔ میرے لیے اس بات پر زور دینے کی خاطر قرآن مجید کی آیات نقل کرتے جانا غیر ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ اگرچہ بڑے عالی مرتبہ انسان تھے مگر ان کو خدا کے بعد دوسرا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے ۔ انسان ہونے کی حیثیت سے، ماسوا اس وحی کے جو ان کے پاس خدا کی طرف

سے آئی تھی، وہ خود اپنے بھی کچھ خیالات رکھتے تھے اور اپنے ان خیالات کے زیر اثر وہ کام کرتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ محمد رسول اللہ نے کوئی گناہ نہیں کیا، مگر وہ غلطیاں تو کر سکتے تھے اور یہ حقیقت خود قرآن میں تسلیم کی گئی ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا۔ (تاکہ اللہ بخش دے تیری اگلی پچھلی خطاؤں کو اور اپنی نعمت تمام کرے تم پر اور راہنمائی کرے تمہاری سیدھے راستے کی طرف)۔

ایک سے زیادہ مقامات پر قرآن میں یہ بیان ہوا ہے کہ محمد رسول اللہ دنیا کے لیے ایک بہت اچھا نمونہ ہیں، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک آدمی کو ویسا ہی ایماندار، ویسا ہی راستباز، ویسا ہی سرگرم اور ویسا ہی دیندار اور متقی ہونا چاہیے جیسے وہ تھے، نہ یہ کہ ہم بھی بعینہٖ اسی طرح سوچیں اور عمل کریں جس طرح وہ سوچتے اور عمل کرتے تھے، کیونکہ یہ تو غیر فطری بات ہوگی اور ایسا کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اگر ہم ایسا کرنے کی کوشش کریں تو زندگی بالکل ہی مشکل ہو جائے گی۔

۲۳۔ یہ بھی صحیح ہے کہ قرآن پاک اس کی تاکید کرتا ہے کہ محمد رسول اللہ کی اطاعت کی جائے مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جہاں انہوں نے ہم کو ایک خاص کام ایک خاص طرح کرنے کا حکم دیا ہے، ہم وہ کام اسی طرح کریں۔ اطاعت تو ایک حکم ہی کی ہو سکتی ہے۔ جہاں کوئی حکم نہ ہو وہاں نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ عدم اطاعت۔ قرآن کے ان ارشادات سے یہ مطلب اخذ کرنا بہت مشکل ہے کہ ہم ٹھیک وہی کچھ کریں جو رسول نے کیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک فرد واحد کے زمانۂ حیات کا تجربہ واقعات کی ایک محدود تعداد سے زیادہ کے لیے نظائر فراہم نہیں کر سکتا، اگرچہ وہ فرد واحد نبی ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ بات پورے زور کے ساتھ کہی جانی چاہیے کہ اسلام نے نبی کو کبھی خدا نہیں سمجھا ہے۔ یہ بالکل واضح بات ہے کہ قرآن اور حدیث میں جو گہری اور حقیقی فرق ہے۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے کہ ایک قوم کے لیے خاص معاملات

میں ضابطۂ اخلاق کیا ہو اور ایک خاص مقدمے کا فیصلہ کس طرح ہو۔ انہیں انصاف اور موجود حالات کے تقاضوں ہی کے مطابق طے کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ (یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہیں اور جب تم فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرو عدل کے ساتھ۔ یقیناً اللہ بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں۔ اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے)۔

اَوْ اَعْرِضْ

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (بہت جھوٹ سننے والے اور حرام خور ہیں، پس اگر تمہارے پاس آئیں تو ان کے درمیان فیصلہ کرو یا اعراض کرو ان سے اور اگر تم ان سے منہ پھیر لو تو تمہارا کچھ بگاڑ نہیں لیں گے اور اگر تم فیصلہ کرو تو فیصلہ کرو ان کے درمیان عدل سے۔ اللہ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۔ (پس اس طرف بلاؤ اور سیدھے رہو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اور مت پیروی کرو ان کی خواہشات کی اور کہو ایمان لایا میں اُس پر جو کچھ اللہ نے نازل کیا کتاب سے اور حکم دیا گیا ہے مجھے کہ میں عدل کروں تمہارے مابین۔ اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ جمع کرے گا ہمیں اور اسی کی طرف پلٹنا ہے)۔

انفرادی اور قومی معاملات کا تصفیہ کرنے کے لیے ہم زمان و مکان کے اختلافات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

۲۴- کوئی مستند شہادت ایسی موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ خلفائے اربعہ محمد رسول اللہ کے اقوال و افعال اور کردار کو کیا اہمیت دیتے تھے؟ لیکن بحث کی خاطر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ افراد کے معاملات اور قومی اہمیت رکھنے والے مسائل کا فیصلہ کرنے میں حدیث کا بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کرتے تھے، تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھے کیونکہ وہ ہماری بہ نسبت بلحاظِ زمانہ بھی اور بلحاظ مقام بھی محمد رسول اللہ سے قریب تر تھے۔ مگر ابو حنیفہ نے جو ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور ستر سال بعد فوت ہوئے، تقریباً ۱۷ احادیث ان مسائل کا فیصلہ کرنے میں استعمال کیں جو اُن کے سامنے پیش کیے گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ رسول اللہ کے زمانے سے اس قدر قریب نہیں تھے جتنے پہلے چار خلفاء تھے۔ انہوں نے اپنے تمام فیصلوں کی بنیاد قرآن کی مکتوب ہدایات پر رکھی اور متن قرآن کے الفاظ کے پیچھے ان محرکات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو ان ہدایات کے موجب تھے۔ وہ استدلال و استنباط کی بڑی قوت رکھتے تھے۔ انہوں نے عملی حقائق کی روشنی میں قیاس کی بنیاد پر قانون کے اصول و نظریات مرتب کیے۔ اگر ابو حنیفہ یہ حق رکھتے تھے کہ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کی تعبیر موجود الوقت حالات کی روشنی میں کریں تو دوسرے مسلمانوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید کی تفسیر اور مقدمات کے فیصلے میں ابو حنیفہ کے اقوال کو حرفِ آخر ان کے شاگردوں اور پیروؤں نے بھی نہیں مانا۔ وہ بہر حال ایک انسان تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے فردِ واحد کی رائے پر انحصار صحیح نہیں ہے۔ ایک قوم کے لیے صرف اُن آراء و قوانین کی پابندی لازمی ہو سکتی ہے جو اس کے منتخب نمائندوں نے بالاجماع طے کیے ہوں۔ ابو حنیفہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سوسائٹی کو جن قواعد و قوانین کی حاجت ہے وہ سب نہیں بلکہ ان میں سے چند ایک ہی قرآن میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس بعد میں آنے والوں میں سے بعض کی رائے یہ تھی کہ

ہر منضبط قانون قرآن میں مضمر تھا اور ان کے استنباط کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ قرآن کے اندر مخفی تھا اُسے وہ منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ میں اس معاملے میں جو بڑا متنازعہ فیہ ہے، اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ آج کل جبکہ ہم ایک منظم اور منضبط دنیا میں جی رہے ہیں اور ہر طرح کی حکیمانہ تحقیق کی سہولتیں ہمیں حاصل ہیں، یہ ٹھیک وقت ہے کہ ہم حدیث کے ماخذِ قانون ہونے کی حیثیت کا جائزہ لیں، نیز اس مسئلے پر بھی غور کریں کہ آیا امام ابوحنیفہ یا ان جیسے دیگر عالی مرتبت فقہاء کے اقوال کی پابندی ہم پر لازم ہے یا حاضر و واقعی حالات کی روشنی میں ہمارے لیے بھی قیاس و استنباط کا حق بحال کیا جا سکتا ہے؟

۲۵۔ تمام فقہائے اسلام اس بات کو بالاتفاق مانتے ہیں کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا جعلی حدیثوں کا ایک جمِ غفیر اسلامی قوانین کا ایک جائز و مسلّم ماخذ بنتا چلا گیا۔ جھوٹی حدیثیں خود محمد رسول اللہ کے زمانے میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ جھوٹی اور غلط حدیثیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دَور میں روایتِ حدیث پر پابندیاں لگا دیں بلکہ اس کی ممانعت کر دی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف نو ہزار کو صحیح احادیث کی حیثیت سے منتخب کیا۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس بات سے انکار کرے گا کہ جس طرح قرآن کو محفوظ کیا گیا اُس طرح کی کوئی کوشش رسول اللہؐ نے اپنے عہد میں احادیث کو محفوظ کرنے کے لیے نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس جو شہادت موجود ہے وہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے سختی کے ساتھ احادیث کو محفوظ کرنے سے منع کیا تھا۔ اگر مسلم کی روایات صحیح ہیں تو محمد رسول اللہ نے پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں کو اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ ان کے اقوال اور افعال کو لکھیں۔ انہوں نے حکم دیا تھا کہ جس کسی نے ان کی احادیث کو محفوظ کر رکھا ہو وہ انہیں فوراً ضائع کر دے۔ لا تکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا ولا حرج۔ اسی حدیث یا ایسی ہی

ایک حدیث کا ترجمہ مولانا محمد علی نے اپنی کتاب " دین اسلام " کے ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں صفحہ ۶۲ پر ان الفاظ میں دیا ہے: " روایت ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا رسول خدا ہمارے پاس آئے اس حال میں کہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا تم لوگ کیا لکھ رہے ہو۔ ہم نے کہا حدیث جو ہم آپ سے سنتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا یہ کیا! اللہ کی کتاب کے سوا ایک اور کتاب!"

اس امر کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ محمد رسول اللہ کے فوراً بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کے زمانے میں احادیث محفوظ یا مرتب کی گئی ہوں اس امر واقعہ کا کیا مطلب لیا جانا چاہیے؟ یہ گہری تحقیقات کا طالب ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ اور ان کے بعد آنے والے چاروں خلفاء نے احادیث کو محفوظ کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ احادیث عام انطباق کے لیے نہیں تھیں؛ مسلمانوں کی بڑی اکثریت نے قرآن کو حفظ کر لیا۔ وہ جس وقت وحی آتی تھی، اس کے فوراً بعد کتابت کا جو سامان بھی میسر آتا تھا اس پر لکھ لیا جاتا تھا اور اس غرض کے لیے رسول کریم نے متعدد تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ لیکن جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ نہ یاد کی گئیں نہ محفوظ کی گئیں۔ وہ ان لوگوں کے ذہنوں میں چھپی پڑی رہیں جو اتفاقاً کبھی دوسروں کے سامنے ان کا ذکر کرنے کے بعد مر گئے، یہاں تک کہ رسول کی وفات کے چند سو برس بعد ان کو جمع اور مرتب کیا گیا۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ یہ معلوم کرنے کے لیے ایک مکمل اور منظم ریسرچ کی جائے کہ عربوں کے حیرت انگیز حافظے اور زبردست قوت یادداشت کے باوجود آیا احادیث کو موجودہ شکل میں قابلِ اعتماد اور صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے؛ یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ بعد میں پہلی مرتبہ رسول اللہ کے تقریباً ایک سو سال بعد احادیث کو جمع کیا گیا مگر ان کا ریکارڈ اب قابلِ حصول نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کو حسبِ ذیل اصحاب نے جمع کیا۔ امام بخاری (متوفی ۲۵۶ھ)۔ امام مسلم (متوفی ۲۶۱ھ)۔ ابو داؤد (متوفی ۲۷۵ھ)۔ جامع ترمذی (متوفی ۲۷۹ھ)، سنن نسائی (متوفی ۳۰۳ھ)، سنن ابن ماجہ (متوفی ۲۸۳ھ)، سنن الدرمی

(متوفی ۱۸۱ھ)۔ بیہقی (ولادت ۳۸۴ھ)۔ امام احمد (پیدائش ۱۶۴ھ)۔ شیعہ حضرات جن جامعینِ حدیث کے مجموعوں کو مستند سمجھتے ہیں وہ یہ ہیں: ابو جعفر (۳۲۹ھ)۔ شیخ علی (۳۸۱ھ)۔ شیخ ابو جعفر محمد بن علی بن حسین (۴۶۰ھ)۔ سید الرضی (۴۰۶ھ)۔ ظاہر ہے کہ یہ مجموعے امام بخاری وغیرہ کے مجموعوں سے بھی بعد میں مرتب کیے گئے۔ ایسی بہت کم احادیث ہیں جن میں یہ جامعینِ حدیث متفق ہوں۔ کیا یہ چیز احادیث کو انتہائی مشکوک نہیں بنا دیتی کہ ان پر اعتماد کیا جا سکے؟ جن لوگوں کو تحقیقات کا کام سپرد کیا گیا ہو وہ ضرور اس بات پر نگاہ رکھیں گے کہ ہزار در ہزار جعلی حدیثیں پھیلائی گئی ہیں تاکہ اسلام اور محمد رسول اللہ کو بدنام کیا جائے۔ انہیں اس بات کو بھی نگاہ میں رکھنا ہوگا کہ عربوں کا حافظہ خواہ کتنا ہی قوی ہو، کیا صرف حافظہ سے نقل کی ہوئی باتیں قابلِ اعتماد سمجھی جا سکتی ہیں؟ آخر آج کے عربوں کا حافظہ بھی تو ویسا ہی ہے جیسے تیرہ سو برس پہلے ان کا حافظہ رہا ہوگا۔ آج کل عربوں کا حافظہ جیسا کچھ ہے وہ ہمیں یہ رائے قائم کرنے کے لیے ایک اہم سراغ کا کام دے سکتا ہے کہ جو روایات ہم تک پہنچی ہیں کیا ان کے صحیح اور حقیقی ہونے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ عربوں کے مبالغے نے، اور جن راویوں کے ذریعے سے یہ روایات ہم تک پہنچی ہیں ان کے اپنے معتقدات اور تعصبات نے بھی ضرور بڑی حد تک نقلِ روایت کو مسخ کیا ہوگا۔ جب الفاظ ایک ذہن سے دوسرے ذہن تک پہنچتے ہیں، وہ ذہن خواہ عرب کا ہو یا کسی اور کا، بہر حال ان الفاظ میں ایسے تغیرات ہو جاتے ہیں جو ہر ذہن کی اپنی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر ذہن ان کو اپنے طرز پر موڑتا توڑتا ہے، اور جبکہ الفاظ بہت سے ذہنوں سے گزر کر آئے ہوں تو ایک شخص تصوّر کر سکتا ہے کہ ان میں کتنا بڑا تغیّر ہو جاتا ہوگا۔ ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ فطرتِ انسانی ہر جگہ یکساں ہے۔ اللہ نے انسان کو ناقص بنایا ہے اور بشری مشاہدہ انتہائی خام اور کمزور ہے۔

۲۶۔ ایک شخص اگر حدیث کے مجموعوں کا مطالعہ کرے تو ان میں کم از کم بعض حدیثیں ایسی بھی موجود ہیں جنہیں داخلی شہادت کی بنا پر صحیح ماننا مشکل ہے۔[1]

---

[1] اس سے آگے فاضل جج نے جو احادیث مع ترجمہ درج کی ہیں وہ فضل الکریم صاحب کے انگریزی ترجمۂ مشکوٰۃ

عن عطاء انه قال دخلت علی عائشة فقلت اخبرینا باعجب ما رأیت من رسول اللہ صلعم فبکت وقالت وای شانه لم یکن عجباً۔ اتانی فی لیلة فدخل معی فی فراشی او قالت فی لحافی، حتیٰ مس جلدی جلده ثم قال یا ابنة ابی بکر ذرینی اتعبد لربی قلت انی احب قربك لكن اوثر هواك فاذنت له فقام الیٰ قربة ماء فتوضأ فلم یکثر صب الماء ثم قام یصلی فبکی حتیٰ سالت دموعه علی صدره ثم رکع فبکی ثم سجد فبکی ثم رفع رأسه فبکی فلم یزل کذالك یبکی حتی جاء بلال فاذنه بالصلوٰة فقلت یا رسول اللہ ما یبکیك وقد غفر اللہ ما تقدم من ذنبك وما تأخر قال افلا اکون عبداً شکوراً۔ (عطاء سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں حضرت عائشہ کے پاس گیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سب سے زیادہ پسندیدہ اور عجیب بات دیکھی ہو وہ بتائیں۔ حضرت عائشہ رو دیں اور فرمایا: آنحضور کی کونسی حالت عجیب اور خوش کُن نہیں تھی[1]۔ ایک رات آپ تشریف لائے اور میرے ساتھ میرے بستر یا لحاف میں داخل ہو گئے حتیٰ کہ میرے بدن نے آپ کے بدن کو چھو لیا۔ پھر فرمایا: اے ابوبکر کی بیٹی۔ مجھے اپنے رب کی عبادت کرنے دو[2]۔ میں نے عرض کیا: مجھے آپ کا قرب پسند ہے لیکن میں آپ کی خواہش کو قابلِ ترجیح سمجھتی ہوں۔ پس میں نے آپ کو اجازت دے دی۔ آپ پانی کے ایک مشکیزے کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر آپ نے وضو کیا اور زیادہ پانی نہیں بہایا۔ پھر آپ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور اتنے روئے کہ آپ کے آنسو آپ کے سینۂ مبارک پر بہ نکلے پھر آپ نے

"الحدیث" جلد اول طبع ۱۹۳۸ء سے جُوں کی تُوں نقل کر دی گئی ہیں۔ ان احادیث کی عبارت اور ان کے ترجمے میں متعدد مقامات پر سخت غلطیاں موجود ہیں۔ اصل مشکوٰۃ سے مراجعت کے بعد ہم نے حتی الوسع ان غلطیوں کی اصلاح کر دی ہے۔ (غ)

[1] اس فقرے کا ترجمہ اصل فیصلے کے متن میں یوں کیا گیا ہے: "اِس سے زیادہ عجیب اور پسندیدہ بات کون سی ہو گی"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

[2] اس فقرے کا ترجمہ فیصلے میں یوں ہے: "مجھے چھوڑ دو۔ کیا تم اپنے رب کی عبادت کرو گی"؟ یہ ترجمہ درست نہیں۔

روتے ہوئے رکوع کیا پھر روتے ہوئے سجدہ کیا، پھر روتے ہوئے سر اٹھایا۔ آپ مسلسل اسی طرح روتے رہے، یہاں تک کہ بلال آئے اور انہوں نے نماز (کا وقت ہو جانے) کی خبر دی میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! آپ کیوں روتے ہیں حالانکہ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے۔ آنحضور نے فرمایا: تو کیا میں ایک شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

عن عائشة قالت كان النبي صلى الله عليه وسلم يقبل بعض ازواجه ثم يصلي و لا يتوضأ (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کسی بیوی کا بوسہ لیتے تھے اور پھر وضو کیے بغیر نماز پڑھ لیتے تھے۔)

عن ام سلمة قالت قالت امُّ سُلَيمٍ يا رسول الله! ان الله لا يستحي من الحق فهل على المرأة من غسل اذا احتلمت قال نعم اذا رأت الماء فغطت ام سلمة وجهها و قالت يا رسول الله او تحتلم المرأة قال نعم تربت يمينك فبم يشبهها ولدها (متفق عليه) وزاد مسلم برواية ام سليم ان ماء الرجل غليظ ابيض وماء المرأة رقيق اصفر فمن ايهما علا او سبق يكون منه الشبه (حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ ام سلیم نے کہا: اے اللہ کے رسول، اللہ حق (بات) سے شرم روا نہیں رکھتا۔ پس کیا عورت پر غسل ہے جب اسے احتلام ہو؟ آنحضور نے فرمایا: ہاں، جب وہ پانی دیکھے (یعنی جبکہ فی الواقع خواب میں اسے انزال ہو گیا ہو)۔ حضرت ام سلمہ نے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، تیرا سیدھا ہاتھ خاک آلودہ ہو، آخر اس کا بچہ اُس سے کیسے مشابہ ہوتا ہے۔ اور مسلم نے ام سلیم کی روایت میں یہ اضافہ کیا کہ مرد کا مادہ گاڑھا سفید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور پیلا۔ پس ان میں سے جو بھی غلبہ حاصل کرے اسی سے مشابہت ہوتی ہے)۔

عن معاذة قالت قالت عائشة كنت اغتسل انا ورسول الله صلعم من اناء واحد بيني وبينه فيبادرني حتى اقول دع لي قالت وهما جنبان۔ (معاذہ سے روایت ہے

کہ حضرت عائشہ نے بتایا کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے جو میرے اور آپ کے درمیان ہوتا تھا۔ آپ مجھ سے زیادہ جلدی کرتے تھے یہاں تک کہ میں کہتی تھی میرے لیے (پانی) چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ اس وقت دونوں حالتِ جنابت میں ہوتے تھے۔)

عن عائشة قالت سُئِلَ رسول الله صلعم عن الرجل يجد البلل ولا يذكر احتلاماً قال يغتسل وعن الرجل الذي يرى انه قد احتلم ولا يجد بَلَلاً قال لاغسل عليه ـ قالت ام سليم هل على المرأة ترى ذالك غسلاً قال نعم، ان النساء شقائق الرجال (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو تری دیکھے لیکن احتلام اُسے یاد نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: وہ غسل کرے اور ایسے شخص کے بارے میں بھی پوچھا گیا، جسے احتلام یاد ہو لیکن وہ تری نہ پاتے۔ آپ نے فرمایا: اس پر غسل نہیں ہے۔ ام سلیم نے کہا: اگر عورت اس طرح (رطوبت) دیکھے، تو اس پر بھی غسل ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، عورتیں مردوں کا آدھا حصہ ہیں)۔

عنها قالت قال رسول الله صلعم اذا جاوز الختان الختان وجب الغسل فعلته انا ورسول الله صلعم فاغتسلنا (انہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شرمگاہوں کے اگلے حصے باہم متجاوز ہو جائیں تو غسل واجب ہے۔ میں نے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا کیا اور غسل کیا)۔

عن عائشة قالت كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يغتسل من الجنابة ثم يستدفئ بى قبل ان اغتسل (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسلِ جنابت کر لینے کے بعد (سردی دُور کرنے کے لیے) مجھ سے گرمی حاصل کرتے تھے، قبل اس کے کہ میں غسل کروں)۔

عن عائشة قالت كنت اغتسل انا والنبى صلعم من اناء واحد وكلانا

جنب وکان یأمرنی فاتزر فیبا شرنی وانا حائض ویخرج رأسه الیّ وھو معتکف فاغسله وانا حائض۔ (حضرت عائشہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میں ایک ہی برتن سے نہاتے تھے در آں حالیکہ ہم دونوں جنبی ہوتے تھے۔ اور آپ مجھے بحالتِ حیض ازار باندھنے کا حکم دیتے تھے اور مجھ سے بغلگیر ہوتے تھے اور آپ اعتکاف کی حالت میں اپنا سر مسجد سے، باہر کرتے تھے اور میں حیض کی حالت میں اسے دھوتی تھی)۔

عن عائشۃ کنت اشرب وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاہ علی موضع فیّ فیشرب واتعرّق العرق وانا حائض ثم اناوله النبی صلعم فیضع فاہ علی موضع فیّ (حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں برتن سے پانی پیتی تھی اور پھر اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب بڑھا دیتی تھی۔ پس آپ وہاں منہ رکھتے تھے جہاں میں نے منہ رکھا ہوتا تھا اور آپ پیتے تھے۔ اور میں بحالتِ حیض ہڈی پر سے گوشت کھاتی تھی اور پھر اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیتی تھی اور آپ اُس جگہ اپنا منہ رکھتے تھے جہاں میں نے رکھا ہوتا تھا)۔

عن عائشۃ قالت کنت اذا حضت نزلت عن المثال علی الحصیر فلم نقرب رسول اللہ صلعم ولم ندن منه حتی نطھر (حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: جب میں حائضہ ہوتی تو میں بستر چھوڑ کر چٹائی پر لیٹتی تھی پس ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقاربت نہیں کرتے تھے جب تک کہ پاکیزگی حاصل نہیں کر لیتے تھے)[1]۔

عنھا قالت قال لی النبی صلعم ناولینی الخمرۃ من المسجد فقلت انی حائض فقال ان حیضتك لیست فی یدك (انہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھے مسجد سے چٹائی اٹھا کر دے دو۔ میں نے عرض کیا کہ میں حیض کی حالت میں ہوں۔

---

[1] اصل فیصلے میں اس حدیث کے نقل کردہ الفاظ اور ترجمے میں بعض غلطیاں تھیں جن سے مطلب خبط ہو جاتا تھا۔ انہیں یہاں درست کر دیا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا: حیض (کا اثر) تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے (یعنی تم ہاتھ بڑھا کر مسجد سے چٹائی لے سکتی ہو)۔

۲۷ - مذکورہ بالا بیشتر احادیث میں جو مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی روایت حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ام سلمہ کی طرف منسوب ہے۔ میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں انہوں نے اسی عریانی کے ساتھ اپنی ان پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہوگا جو ان کے اور محمد رسول اللہ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوتی ہونگی۔

۲۸ - میں اپنے آپ کو یہ یقین کرنے کے ناقابل پاتا ہوں کہ محمد رسول اللہ نے یہ باتیں کہی ہونگی کہ دوزخ میں اکثریت عورتوں پر مشتمل ہوگی اور جنت کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہوگی۔

عن اسامة بن زيد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قمت على باب الجنة فكان عامة من دخلها المساكين واصحاب الجد محبوسون غيران[1] اصحاب النار قد امر بهم الى النار وقمت على باب النار فاذا عامة من دخلها النساء (اسامہ بن زید سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا اور (میں نے دیکھا) کہ اکثریت جو اس میں داخل ہو رہی تھی وہ مساکین کی تھی اور دولت مند لوگ روک لیے گئے، سوائے اس کے کہ جو لوگ آگ کے لائق تھے انہیں آگ میں ڈالے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ اور میں آگ کے دروازے پر کھڑا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اُس میں داخل ہونے والی بالعموم عورتیں تھیں)۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اطلعت فى الجنة فرايت اكثر اهلها الفقراء واطلعت فى النار فرايت اكثر اهلها النساء (ابن عباس سے روایت ہے انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے

---

[1] غَیْرَاَنَّ کا ترجمہ فیصلے میں IN ADDITION TO درج ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

جنّت میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت فقراء کی ہے اور مَیں نے دوزخ میں جھانک کر دیکھا تو اس میں اکثریت عورتوں کی ہے ۔

۲۹۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو دولت کمانے سے بالواسطہ طریق پر منع کر دیا گیا ہے ، کیونکہ اگر وہ دولت حاصل کریں گے تو ان کے جنّت میں داخلے کے امکانات کم ہو جائیں گے ؟ اگر سارے مسلمان غریب ہو جائیں تو ان کا کیا بنے گا ؟ کیا ان کا کلّی طور پر خاتمہ نہیں ہو جائے گا ؟ کیا اس طرح زندگی کے ہر میدان میں ان کی ترقی رُک نہیں جائے گی ؟ مزید برآں کیا یہ قابلِ یقین ہے کہ محمد رسول اللہ نے وہ بات فرمائی ہوگی جو حدیث بخاری کے صفحہ ۸۵۲ پر روایت نمبر ۷۴/۶۰۲ میں عبداللہ بن قیس سے مروی ہے کہ "مسلمان جنت میں اُن عورتوں سے مباشرت کریں گے جو ایک خیمہ کے مختلف گوشوں میں بیٹھی ہونگی " حدیثوں اور قرآن مجید کی پرانی تفسیروں نے اسلام کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اور اس کی وسعت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔ کیا ہمیں ان حالات کو برقرار رہنے دینا چاہیے ؟

۳۰۔ بحث کی خاطر اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ جو احادیث محدثین نے جمع کی ہیں وہ صحیح ہیں ، تب بھی اس امر کی شہادت موجود ہے کہ اگر ان احادیث کا تعلق دین سے نہ ہو ، تو رسول اللہ انہیں حرفِ آخر کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے ۔ مسلم میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے :

عن رافع بن خدیج قال قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ وھم یأبرون النخل فقال ما تصنعون قالوا کنّا نصنعہ قال لعلکم لو لم تفعلوا کان خیرا۔ فترکوہ فنقصت فذکروا ذالک لہ فقال انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من امر دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیء من رأی فانما انا بشر

(رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ مدینے کے لوگ کھجوروں میں پیوند لگاتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا : تم لوگ یہ کیا کرتے ہو ؟ انہوں نے جواب دیا : ہم پہلے سے ایسا کرتے آتے ہیں ۔ آپ نے فرمایا : شاید تم ایسا نہ کرتے

تو بہتر ہوتا۔ پس لوگوں نے یہ عمل چھوڑ دیا اور پیداوار کم ہوئی انہوں نے آنحضورؐ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: میں انسان ہوں، جب میں تمہارے دین کے معاملے میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی پیروی کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بس ایک بشر ہی ہوں۔"

اس کے علاوہ ایک سے زائد احادیث میں محمد رسول اللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صرف قرآن ہی وہ ایک کتاب ہے جو تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کی رہنما ہونی چاہیے۔

۳۱۔ یہ بات کہ محدثین خود اپنی جمع کردہ احادیث کی صحت پر مطمئن نہ تھے صرف اسی ایک امر واقعہ سے واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے یہ نہیں کہتے کہ ہماری جمع کردہ احادیث کو صحیح مان لو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے معیارِ صحت پر جانچ کر اپنا اطمینان کر لو۔ اگر انہیں ان احادیث کی صحت کا یقین ہوتا تو یہ جانچنے کا سوال بالکل غیر ضروری تھا۔

۳۲۔ بعض احادیث ایسی ہیں جو انسان کی توجہ اس دنیا سے ہٹا دیتی ہیں۔ روحانیت ایک اچھی چیز ہے لیکن اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اسے بیہودہ انتہا تک پہنچا دیں۔ بنیادی طور پر اللہ نے ہمیں انسان بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم اسی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔ اگر وہ چاہتا کہ ہم روحانی مخلوق یا فرشتے بن جائیں، تو اس کے لیے اس سے زیادہ آسان بات کوئی اور نہیں تھی کہ وہ ہمیں ایسا ہی بنا دیتا۔ حقیقی اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں کو اپنی توانائیاں اس مقصد کے لیے صرف کرنی چاہییں کہ وہ زندگی کو مفید تر، حسین تر اور مکمل طور پر پُرلطف بنا سکیں۔

۳۳۔ اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اکثر احادیث مختصر اور بے ربط ہیں جنہیں سیاق و سباق اور موقع و محل سے الگ کرکے بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور ان کا صحیح مفہوم و مدعا مشخص کرنا ممکن نہیں ہے جب تک ان کا سیاق و سباق سامنے نہ ہو اور وہ حالات معلوم نہ ہوں جن میں رسولِ پاک نے کوئی بات کہی ہے یا کوئی کام کیا ہے۔ بہرحال احادیث کی بالکل نئے سرے سے پوری چھان بین اور تحقیق کی ضرورت

ہے۔ یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ حدیث قرآن کے احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ مگر کم از کم ایک مسئلے میں تو احادیث نے قرآن پاک میں ترمیم کر دی ہے اور وہ وصیت کا مسئلہ ہے۔ احادیث کے بارے میں پورا غور و تامل کرنے کے بعد میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں کہ انہیں اپنی موجودہ شکل میں قرآن کے برابر درجہ نہیں دینا چاہیے اور نہ ہی اُن کے اطلاق کو عام خیال کرنا چاہیے۔ میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ مختلف محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کیا جائے جب تک ان کی دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی کسی تنگ نظری اور تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان تمام قواعد و شرائط کو بھی از سرِ نو استعمال کیا جانا چاہیے جنہیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی، موضوع اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا، نیز ان معیارات کو بھی کام میں لانا چاہیے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے لیے فراہم کیے ہیں۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ حقائق موجودہ کی روشنی میں قیاس و استدلال کے نازک اور لطیف طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے ججوں اور عوام کے منتخب نمائندوں کو قرآن پاک کی تفسیر کرنی چاہیے۔ ابو حنیفہ اور اس طرح کے دوسرے فقہا نے جو فیصلے کیے ہیں اور جو بعض کتابوں میں مذکور ہیں انہیں نظائر کی حیثیت میں وہی درجہ استناد دیا جانا چاہیے جو عام عدالتی فیصلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے اندر مندرج قانون جامد نہیں بلکہ متحرک و منظم ہے۔ قرآن مجید کی تعبیر کو اس انسانی طرزِ عمل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے جو حالاتِ حاضرہ سے متاثر اور مختلف عناصر سے متعین ہوتا ہے۔ ابو حنیفہ کی طرح دنیوی معاملات کی تحقیقات میں عقل کو استعمال میں لانا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق برِعظیم ہند و پاکستان کے مسلمانوں کا قانون وسیع تغیرات کا محتاج ہے اور اسے ملک کے موجودہ حالات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔

[اس کے بعد پیرا ۳۴ سے لے کر آخری پیراگراف (۴۱) تک فاضل جج نے اپیل کے اصل تصفیہ طلب مسئلہ یعنی مسئلۂ حضانت پر بحث کی ہے اور یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر جامعینِ حدیث کی روایات کو صحیح اور قرآن کی طرح واجب الاتباع تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی ان سے حضانت کے معاملے میں مسلمانوں کے مروّج شخصی قانون کی تائید نہیں ہوتی۔ اگرچہ فیصلے کا یہ حصّہ بھی بہت غور طلب اور لائقِ توجہ ہے، تاہم یہ چونکہ اصل موضوعِ فیصلہ سے تعلق رکھتا ہے اور اسے زیرِ بحث لانا مقصود نہیں ہے، اس لیے اس کا ترجمہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس حصے کو اصل انگریزی فیصلے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے] ۔